عرضِ مدّعا

میں ذاتی حیثیت میں ادب کی ایک ادنیٰ قاری ہوں۔ اس وقت آپ سے گفتگو کا شرف حاصل کرتے ہوئے آپ کی توجہ ایک ایسی کتاب کی طرف مبذول کرانا چاہتی ہوں جسے اس کے قابلِ احترام مصنف نے خونِ دل سے سچے حرفوں میں لکھا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ میں خود بھی اس کتاب سے بے خبر رہتی اگر اپنے کاروباری معاملات اور مصروفیات کی وجہ سے میرے بیٹے کو دُبئی نہ آنا پڑتا۔ دُبئی اپنی خوب صورت عمارات، سامانِ تعیش سے بھرے ہوئے اسٹورز اور قانون کی بالا دستی کے حوالے سے خاصی شہرت رکھتا ہے۔ لیکن یہاں کوئی قابلِ ذکر لائبریری نہیں ہے۔ کتابوں کی دو ایک دُکانیں ہیں، ان پر بھی علمی ادبی کتابیں نہ ہونے کے برابر نظر آتی ہیں۔ ادھر یہ کہ مطالعہ میرا مشغلۂ حیات بنا ہوا ہے۔ کتابوں کی اشاعت سے بھی یک گونہ دلچسپی ہے۔ ادارۂ یادگارِ غالب کے زیرِاہتمام میں پہلے بھی ایک کتاب ''یادگارِ غالب'' شائع کرا چکی ہوں۔ اہلِ نظر قارئینِ علم و ادب کی خدمت میں زیرِ نظر کتاب میری جانب سے دوسرا تحفہ ہے۔

ایک روز کتابوں کی ایک دُکان پر روزنامہ ''آج'' پشاور نظر آیا۔ گھر لا کر پڑھا۔ ادارتی صفحہ پڑھ کر تو بے حد حیرت ہوئی کہ ہمارے ہاں اتنا سچ بھی لکھا جا سکتا

ہے... اور وہ بھی اتنے سیدھے سادے انداز میں... نہ لفظوں کی مینا کاری اور نہ لہجے کی جگمگاہٹ۔ قابلِ ستائش ہیں وہ سب اہلِ قلم جو سچائی کا بھرم رکھتے ہیں۔ وہ اپنے ہی نہیں اپنے قارئین کے احساسات کو بھی ہر طرح کے نفع نقصان سے بے پروا ہو کر زبان دیتے ہیں۔ اس ادارتی صفحے کے سبھی قلم کار اپنے شعبے کی آبرو ہیں لیکن اس وقت میں خاص طور سے ذکر کر رہی ہوں پشاور یونی ورسٹی کے ریٹائرڈ پروفیسر ڈاکٹر ظہور احمد اعوان صاحب کا جو کہ اب ایک روپیہ ماہانہ کے مشاہرے پر خدمتِ خلق کے جذبے سے کام کر رہے ہیں۔ وہ لگ بھگ چالیس کتابوں کے مصنف، مرتب اور مترجم ہیں۔ ''کتابِ سعید'' کے نام سے وہ حکیم سعید صاحب کی زندگی میں اُن پر سوانحی کتاب لکھ کر انھیں پیش کر چکے ہیں۔ ''تاریخِ رپورتاژ نگاری'' ان کی ایک اور قابلِ قدر کتاب ہے۔

ڈاکٹر ظہور احمد اعوان کی زیرِ نظر کتاب ''اقبال شریعتی علی شریعتی'' پڑھ کر میں نے محسوس کیا کہ یہ تو اصل میں ایک آئینہ ہے جس میں ہم من حیث القوم اپنا سراپا، اپنے اطوار اور اپنے فکر و احساس کا نظارہ کر سکتے ہیں۔ افسوس صد افسوس کہ ہم نے اپنی صورتِ حال اور اپنے کرتوتوں پر شرمندہ ہونا بھی چھوڑ دیا ہے۔ علامہ اقبال اور ان کے افکار کے ساتھ بھی ہم نے اچھا سلوک نہیں کیا ہے۔ وارث علوی کے بقول، ہم نے اقبال کو ایک ایسی صنعت بنا لیا ہے کہ جو سامنے بھی نہ آئے اور مخفی بھی نہ ہو۔ مجھے یقین ہے کہ زیرِ نظر کتاب پڑھ کر جہاں آپ کو خوشی ہوگی کہ ایک اچھی اور فکر انگیز کتاب کا مطالعہ کیا، وہاں افسوس بھی ہوگا کہ آپ اب تک اس کتاب سے محروم کیوں رہے؟ لوگوں کو اچھے مطالعے کی دعوت دینا بھی کارِ خیر ہے۔ امید ہے آپ بھی اس کام میں شرکت کریں گے۔

میں اس کتاب کی اشاعت میں ڈاکٹر شیر شاہ سیّد کے بھرپور تعاون پر شکر گزار اور اُن کے لیے دعا گو ہوں۔

شکیلہ رحمٰن

علی شریعتی ایک نظر میں

۱۹۳۳ء (۲۳ر نومبر)	پیدائش مزینان (ایران)
۱۹۴۰ء	اسکول اور گھر میں تعلیم
۱۹۵۰ء۔۱۹۵۶ء	تحریکِ خدا پرست سوشلسٹ میں شمولیت
	مرکزِ اشاعت السلام میں شمولیت
	مشہد میں اسلامک اسٹوڈنٹ ایسوسی ایشن کا قیام
	طالبِ علم پرائمری ٹیچرز ٹریننگ کالج
	پیشہ مدرّسی
	سیاسی سرگرمیوں کا آغاز، ایرانی تیل انڈسٹری کو قومیانے کی تحریک میں عملی حصہ اور پہلی مرتبہ جیل جانا
	اشاعتِ مکتب وسطیٰ نامی کتب
	''خدا پرست سوشلسٹ... ابوذر غفاریؓ'' نامی کتاب کا ترجمہ
	مشہد یونی ورسٹی میں تعلیم کا آغاز
۱۹۵۷ء	پوران شریعتی سے محبت اور شادی

۱۹۵۸ء	بی اے میں کامیابی (مضامین عربی اور فرانسیسی)
	عربی اسکالر ڈاکٹر مندر کی کتاب ''درنقدِ ادب'' کا فارسی ترجمہ
	فرانس میں تعلیمی اسکالرشپ کی منظوری
۱۹۵۹ء	پیرس کی سوبورن یونی ورسٹی میں تعلیم کا آغاز
۱۹۶۰ء	الیکس کیرل کی کتاب ''لاپریری'' کا ترجمہ ''نیایش'' کے نام سے
۱۹۶۱ء	''بہ کجا تکیہ کنم'' نامی کتاب کی تصنیف
	مصطفیٰ کامران، ابراہیم یزدی کے تعاون سے تحریکِ آزادیِ
	ایران نامی تنظیم کا قیام (نزہتِ آزادیِ ایران خارج از کشور)
۱۹۶۲ء	سیکنڈ نیشنل فرنٹ کی تشکیل
	الجیرین تحریکِ آزادی میں عملی حصہ
	اور کانگو کے طلبہ کو اکسانے پر فرانس میں جیل کی سزا
	شی گویرا کی کتاب ''گوریلا حکمتِ عملی''، سارتر کی کتاب ''شاعری
	کیا ہے'' اور فینن کی کتاب ''افتادگانِ خاک'' کا ترجمہ کیا
۱۹۶۳ء	پی ایچ ڈی کے لیے مقالہ بہ عنوان ''فضائلِ بلخ'' فرانسیسی ترجمے
	کی صورت میں پیش کیا (Les Merites de Balakh)
۱۹۶۴ء	ایران کو واپسی، بارڈر پر ہی گرفتاری اور چھ ماہ قید
۱۹۶۵ء	لوئی ماسینون کی کتاب ''سلمان پاک'' کا ترجمہ کیا
	ہائی اسکول میں ملازمت
	کالج آف ایگری کلچر میں ملازمت
	''راہنمائے خراسان'' کی تصنیف
۱۹۶۶ء	تہران جا کر حسینیہ ارشاد کے قیام میں مدد
۱۹۶۶ء۔ ۱۹۶۸ء	حسینیہ ارشاد میں لیکچروں کا سلسلہ
۱۹۷۰ء	پہلا حج

۱۹۷۰ء	دوسرا حج
۱۹۷۲ء	سیاسی انقلابی سرگرمیوں کی پاداش میں حسینیہ ارشاد کی بندش اور علی شریعتی کی گرفتاری
۱۹۷۳ء	۱۸ ماہ تک جیل میں بندش اور تشدد
۱۹۷۵ء۔ ۱۹۷۷ء	حکم زباں بندی گھر میں نظر بندی چھپ چھپ کر لیکچر دینا
۱۹۷۷ء (مئی)	جلا وطنی، لندن میں قیام
۱۹۷۷ء (۱۹ر جون)	پراسرار حالات میں اپنے اپارٹمنٹ کے اندر ساوک کے کارندوں کے ہاتھوں شہادت
۱۹۷۷ء	دمشق میں بی بی زینبؑ کے مزار کے قریب سپردِ خاک ہونا
۱۹۷۹ء	کُلیات کی اشاعت

عبارت مختصر

علی شریعتی کو جس وقت شہید کیا جا رہا تھا، اس وقت میں ایک آرام دہ گھر میں اپنے بال بچوں میں بیٹھا زندگی کے خوش حال دن گزار رہا تھا۔ مجھے پتا بھی نہیں تھا کہ علی شریعتی کون ہے؟ اور یہ کوئی اتنی پرانی بات بھی نہیں۔ یہ ۱۹۷۷ء کا زمانہ تھا۔ میں اس وقت پارہ چنار کالج میں ہوتا تھا۔ وہاں بھی کسی سے علی شریعتی کا ذکر نہیں سنا تھا۔ ایک دن ایک اخباری مضمون نظروں سے گزرا۔ اس میں ایک دانشور کا قول نقل تھا، ''قرآن مُردوں کو سنانے کی جگہ زندوں کو سنانے کے لیے قبرستان سے اٹھا کر شہروں، گھروں اور دفتروں، بازاروں میں لے جاؤ۔'' اس جملے نے مجھے چونکا دیا۔ اس شخص کی کھوج شروع کر دی۔

پتا چلا کہ اسے ایرانی شہنشاہیت کے خلاف جدوجہد کرنے کی پاداش میں لندن کے ایک سنسان اپارٹمنٹ میں شہید کر دیا گیا ہے۔ شہادت کے وقت عمر ۴۴ سال تھی، پیشے کے لحاظ سے پروفیسر تھا، فرانس کی سوبورن یونی ورسٹی سے سوشیالوجی میں پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی تھی، علی تقی شریعتی نامی عالمِ دین کا بیٹا تھا، علم کو عمل سمجھتا تھا اور عمل کا پیوند جرأت اور جی داری سے جوڑ دیا تھا۔ ۱۹۳۳ء میں ایک گاؤں میں پیدا ہوا، مشرقی تعلیم گھر سے ملی، مغربی تعلیم یونی ورسٹی سے حاصل کی۔ عربی اور فرانسیسی زبان پر عبور

حاصل کیا۔ اس کو راہِ راست پر لانے کے لیے فرانس بھیجا گیا مگر وہ مغربی سامراج کا غلام و گرویدہ ہونے کی جگہ سچے اسلام کا زبردست پرچارک بن کر لوٹا۔ سارے مغربی علم کو اس نے اسلام کی کسوٹی پر پرکھا اور اسلام کو دنیا کا سب سے بڑا انقلاب قرار دے کر اپنی زندگی اس کے لیے وقف کردی۔ اس نے تاریخِ اسلام کے مطالعے کے بعد یہ نتیجہ نکالا کہ اسلام کو سوشلزم، کمیونزم، کیپٹلزم، نوآبادیاتی نظام، سائنس و ٹیکنالوجی، شہنشاہیت اور آمریت سے بڑھ کر خطرہ اس جھوٹے اسلام سے ہے جسے سچے اسلام کی جگہ لاکر بٹھا دیا گیا ہے۔ اس کی نگاہ میں مشرقی معاشروں میں جہالت، غربت، آمریت، تعصب، تنگ نظری ایسے سبھی شاخسانے ہیں سوڈو اسلام کی کامیابی کے جسے ان خطّوں پر مسلط شاہوں نے پیشواؤں کے ساتھ مل کر نافذ کر رکھا ہے۔ چنانچہ سب سے پہلا جہاد ان لات و منات کے خلاف ہونا چاہیے جو خدا کے نام پر مسلم کعبے میں لاکر رکھ دیے گئے ہیں۔

میں جوں جوں علی شریعتی کے خیالات سے آگہی حاصل کرتا جاتا، میرا اشتیاق بڑھتا جاتا۔ چنانچہ ایران جانے والے ہر واقف کار سے یہی مطالبہ کرتا کہ علی شریعتی کی کتابیں لے کر آئے۔ اس طرح علی شریعتی کی بہت سی تصانیف اور اس کے ترجمے مجھے پڑھنے کو ملتے گئے۔ اردو میں ان پر معلومات تو بہت کم تھیں، تاہم انگریزی ترجموں نے کافی مدد کی۔ جدید فارسی زبان کو سمجھنے میں دشواری تھی۔ اس سلسلے میں اپنے دوست اور فارسی زبان کے اسکالر پروفیسر محمد اقبال سے کافی مدد لی۔ دورانِ مطالعہ پتا چلا کہ علی شریعتی نے علامہ اقبال پر ایک کتاب ''ماوٗ اقبال'' کے نام سے تصنیف کی ہے۔ اس وقت یہ کتاب صرف فارسی زبان میں تھی۔ اس کے ایک حصے کا ترجمہ ڈاکٹر ریاض نے کیا تھا مگر مجھے اس کا علم نہ تھا۔ میں نے پروفیسر اقبال سے استدعا کی کہ وہ ''ماوٗ اقبال'' کا اردو ترجمہ کردیں۔ شب و روز ان کو کچوکے دے دے کر ترجمہ کروایا مگر جب ترجمہ دیکھا تو ہاتھوں کے طوطے اُڑ گئے۔

پروفیسر اقبال زبردست خطیب و ادیب آدمی ہیں مگر ترجمہ انھوں نے لفظ بہ لفظ کیا تھا۔ علی شریعتی کی اکثر تصانیف تحریری کی جگہ تقریری ہیں یعنی انھوں نے اپنی پرخطر زندگی میں جگہ جگہ جو لیکچر دیے تھے، ان کو بعد میں ان کے شاگردوں یا سننے والوں نے

کتابی صورت میں چھپوا دیا تھا۔ عام طور پر ان کے لیکچر کافی مربوط ہوتے تھے مگر پھر بھی لیکچر میں خطابت کے ساتھ تکرار اور حشو و زوائد کی بھی کثرت ہوتی ہے۔ ایسی حالت میں کتابی روپ اور پھر اس کا ترجمہ ایک بہت ہی مشکل کام تھا۔ علی شریعتی کے خطیبانہ جملے ملٹن کی نثری تصنیف ''اروپے جی ٹیکا'' کی طرح طویل اور گنجلک ہوجاتے ہیں۔ جملہ ایک صفحے سے شروع ہوا تو فل اسٹاپ دوسرے صفحے پر آیا۔ بیچ میں معانی و مفاہیم کا ایک زبردست تانا بانا ہوتا ہے۔ پروفیسر اقبال بھی بڑے الجھے۔ انھوں نے اس کا حل یہ نکالا کہ جہاں ہے اور جیسا ہے کی بنیاد پر ترجمہ کردیا جائے۔ اس صورتِ حال میں اکثر مطلب خبط ہوجاتا۔ میں نے جب یہ صورتِ حال دیکھی تو اقبالی ترجمے کو چوم کر رکھ دیا۔ دو تین سال تک یہ ترجمہ اسی طرح پڑا رہا۔ جوں ہی اِدھر کا رخ کرتا، خوف دامن گیر ہوجاتا۔ اس کے بعد اقبال صاحب سے دوبارہ استدعا کی کہ اسے مزید آسان بنائیں۔ انھوں نے میری درخواست پر دوبارہ اپنے ہی ترجمے کو ڈی کوڈ کرنا شروع کیا۔ اس کے بعد جو نسخہ بنا،اس سے مطلب و مفہوم کا تھوڑا بہت سرا تو ہاتھ آیا مگر ربط و ترتیب کی صورت معدوم نظر آتی تھی۔ چنانچہ ایک دن میں نے اللہ کا نام لے کر خود لنگوٹ کسا اور دونوں لفظی ترجموں کو سامنے رکھ کر اپنے طور پر جو سمجھ آیا اسے آزاد ترجمے کی صورت میں تیسری بار ازسرِنو تحریر کر ڈالا۔ اس کتاب میں جو ترجمہ چھپا ہے، وہ اس قسم کا اٹکل پچو آزاد ترجمہ ہے۔

اس کتاب میں ''ماؤ اقبال'' نامی لیکچر کا ترجمہ شامل کرنے کی ایک وجہ یہ تھی کہ اوّل تو اس کتاب کا پورا اردو ترجمہ میری معلومات کے مطابق پاکستان میں دستیاب نہ تھا۔ ڈاکٹر ریاض نے دفترِ اوّل کا ترجمہ ۱۹۸۲ء میں کیا تھا۔ دفترِ دوم کا ترجمہ بھی ایک اطلاع کے مطابق انھوں نے حال ہی میں کیا ہے۔ مگر آخری اطلاعات تک چھپ کر مارکیٹ میں نہیں آیا۔ چنانچہ ہم نے اس کتاب کے دونوں حصوں کا آزاد اردو ترجمہ کرنے کا فیصلہ کرلیا۔

ہمارا بنیادی مقصد تو صرف ''ماؤ اقبال'' کا اردو ترجمہ ہی پیش کرنا تھا مگر اسی کتاب میں جب علی شریعتی اور اقبال کی ذہنی ہم آہنگی اور خیالات کی حد درجہ مماثلت کے نمونے دیکھے تو خیال آیا کہ کیوں نہ دونوں دانشوروں کا تقابلی مطالعہ پیش کردیا

جائے۔ یہ بات بھی ہمارے پیشِ نظر تھی کہ علی شریعتی کا نثری سرمایہ ابھی پوری طرح اردو یا انگریزی زبان میں منتقل نہیں ہوا۔ اِدھر اقبال خود ایک جہانِ دگر ہے۔ چنانچہ یہ بہت بڑا کام نظر آیا۔ ابھی اقبال کو ہی اس ملک میں نہیں سمجھا گیا تو علی شریعتی کی فکر کو آگے بڑھانے سے کیا حاصل ہوگا۔ یہ خیال آتا تو اس منصوبے کو چھوڑ دیتا مگر پھر علی شریعتی شہید کا چہرہ آنکھوں کے سامنے گھوم جاتا۔ اس نے جوانی کے عالم میں شہادت کا جام نوش کیا۔ وہ ایک فکر کو عام کرنا چاہتا تھا۔ اقبال کو اس نے اپنی کتاب میں ''علی نما'' کہہ کر پکارا ہے۔ یہ ایک ایسا اعزاز ہے جو علی شریعتی کے مسلک سے تعلق رکھنے والا کوئی بھی شخص کسی انسان کو دینے سے پہلے ہزار مرتبہ سوچے گا۔ علی شریعتی نے اقبال کو نہ صرف ''علی نما'' کہا بلکہ اسے اپنا ذہنی اور فکری استاد بھی مانا۔

علی شریعتی کی تحریروں کا مطالعہ کرتے ہوئے یوں معلوم ہوتا ہے کہ کوئی شخص اقبال کے اشعار کو فارسی نثر میں پیش کر رہا ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ اقبال کی روح علی شریعتی میں حلول کر گئی ہے۔ علی شریعتی جب پیدا ہوا تو اس وقت اقبال کو فوت ہوئے ۵ سال گزر چکے تھے۔ علی شریعتی کے ایران میں اقبال کوئی زیادہ مقبول و معروف شاعر دانشور بھی نہیں تھا۔ اس کی شاعرانہ حیثیت کو تو کسی کم تر درجے پر شاید کچھ حلقوں میں پہچان لیا گیا تھا مگر اس کی انقلابی فکر اور تشکیلِ الٰہیاتِ جدید کو سمجھنے یا عام کرنے کی گنجائش اس وقت دور دور تک نظر نہیں آتی تھی۔ اس عالم میں داد دینی چاہیے علی شریعتی کی بصیرت اور بالغ نظری کو کہ اس نے سچے اسلام کی طرح سچے اقبال کو بھی پہچان لیا۔

اسلام اور قرآن کی طرح مسلم برِصغیر کا یہ المیہ بھی ہے کہ یہاں اقبال جیسے دانشور، انقلابی، ترقی پسند اور روشن فکر مسلمان کو صحیح طور پر نہیں سمجھا گیا اور ہر طالع آزما نے اقبال کے کلام سے اپنے لیے فال نکالی۔ حتیٰ کہ ہماری قوم پر گیارہ سال تک مسلط رہنے والا ایک آمر بھی اقبال کے کلام سے اپنے حقِ حکمرانی کے لیے سند حاصل کرتا اور کرائے کے اقبال فروشوں سے توالیاں کروا کر سنتا رہا۔ اس تناظر میں جب علی شریعتی کی فکر کا ہم مطالعہ کرتے ہیں تو حیرت کے ساتھ خوشی بھی ہوتی ہے۔ علی شریعتی نے نہ صرف اقبال کو خود صحیح طور پر سمجھا بلکہ اس کے ساتھ ساتھ اس نے اپنی تمام فکری بصیرت کو کام میں لا کر فکرِ اقبال کو ایرانی عوام سے بھی روشناس کروایا۔ علی شریعتی کی فکر کے اس پہلو نے

مجھے بہت زیادہ متاثر کیا۔ چنانچہ میں نے اس پہلو کو اجاگر کرنے کے لیے ''ماؤ اقبال'' کے آزاد ترجمے کے ساتھ اقبال و علی شریعتی کا ایک ابتدائی موازنہ بھی اس کتاب میں شامل کر دیا ہے۔

علی شریعتی کی کچھ کتابیں مجھے میسر آ گئی تھیں۔ کچھ تک ابھی تک میں نہیں پہنچ سکا تھا۔ جو مواد مجھے مل گیا تھا، اس کے مطالعے کے بعد میں نے فکرِ شریعتی کا ایک خلاصہ پیش کرنے کی بھی کوشش کی جسے ''تصانیفِ شریعتی'' کے عنوان سے اس کتاب میں شامل کیا گیا ہے۔

علی شریعتی کے کلام و فکر کی ترویج و اشاعت کے سلسلے میں اقبال و شریعتی فاؤنڈیشن کے نام سے ایک ادارہ گزشتہ چند سالوں سے لاہور میں کام کر رہا ہے جو سال بہ سال ایک اقبال شریعتی سیمینار منعقد کرواتا ہے۔ ان سیمیناروں کی روداد کو بعد میں پمفلٹوں کی صورت میں شائع کر دیا جاتا ہے۔ اس ادارے سے متعلق ایک سہ ماہی رسالہ ''وژن'' بھی گزشتہ چار پانچ سال سے نکل رہا ہے۔ اس میں بھی اقبال شریعتی سے متعلق تحریریں چھپتی رہتی ہیں۔ میں نے اس ادارے سے بھی رابطہ قائم کیا۔ انھوں نے اپنی فاؤنڈیشن کی طرف سے ہونے والے سیمیناروں کی مطبوعہ رپورٹیں ارسال کیں۔ اس کے علاوہ کوئی ٹھوس علمی کام علی شریعتی کے حوالے سے میرے سامنے نہیں آیا۔

میں نے ایران کے اشاعتی اداروں سے بھی رابطہ قائم کیا۔ وہاں سے بھی فارسی میں چھپی علی شریعتی کی چند تصانیف کی فہرست کے علاوہ اور کوئی قابلِ ذکر امداد نہیں مل سکی۔ ایران جانے والے اپنے چند دانشور دوستوں سے بھی درخواست کرتا رہا کہ وہ وہاں کی لائبریریوں اور اشاعتی مراکز میں جا کر کچھ ایسی چیزوں کی نشان دہی کریں جو اس تحقیق کے سلسلے میں معاون ثابت ہو سکتی ہوں۔ میرے ان پروفیسر دوستوں کی رپورٹ یہی ہے کہ ایران کی لائبریریوں میں علی شریعتی پر زیادہ مواد موجود نہیں ہے۔ جو کتابیں وہ میرے لیے لے کر بھی آئے، وہ میرے پاس پہلے سے موجود تھیں۔ ان دوستوں کے اسمائے گرامی پروفیسر دلدار حسین بنگش، پروفیسر عابس حسین، پروفیسر صابر حسین اور پروفیسر اصغر حسین ہیں۔

میں نے خود بھی ایران جانے کا پروگرام بنا رکھا تھا۔ اس سلسلے میں ایرانی

قونصلیٹ سے علمی امداد و تعاون کی استدعا کی۔ میرا خیال تھا کہ ایران جاکر ڈاکٹر شریعتی شہید کی بیوہ محترمہ پوران شریعتی اور ان کے بچوں کے انٹرویو ریکارڈ کروں۔ اس کے علاوہ علی شریعتی کے دوستوں، مداحوں اور دوسرے واقفانِ حال سے گفتگو کروں اور پھر ان کے ماحصل کو اس کتاب میں ایک باب کے طور پر شامل کروں۔ ابھی تک ایران جانے کا پروگرام حتمی طور پر طے نہیں ہوا۔ اس دوران میری کتاب کا مسودہ تیار ہوگیا۔ دوستوں نے مشورہ دیا کہ اس کتاب کو علی شریعتی اور اقبال کے موازنے کے طور پر شائع کردیا جائے اور اس کے بعد ایران سے حاصل ہونے والے دوسرے مواد کو ایک کتابی صورت میں شائع کردیا جائے۔

جو کتاب اس وقت آپ کے ہاتھوں میں ہے، وہ علی شریعتی و اقبال کا ایک ادھورا سا تعارف ہے۔ میری یہ شدید خواہش ہے کہ ہمارے ملک کے نوجوان علی شریعتی کی تحریروں سے آگاہی حاصل کریں۔

علی شریعتی نے آج کی زبان میں اسلام کی فکر کو آج کے انسانوں کے سامنے پیش کیا۔ وہ شاعر یا فلسفی نہ تھا۔ کوئی فن کار اور پیشہ ور شعبدہ کار نہ تھا۔ وہ جدید دور کا پڑھا لکھا ایک نوجوان اسکالر تھا جو اسلام کی روح کو خود سمجھنے کے بعد اسے دنیا میں عام کرنا چاہتا تھا۔ قدرت نے اس کو بے پناہ خطیبانہ صلاحیتوں سے نوازا تھا۔ چنانچہ اس نے زبان اور قلم کے ذریعے عملی جہاد کرنے کا بیڑا اٹھایا۔ اس وقت کے ایران میں شاہ کی آمریت اپنے جوبن پہ تھی۔ شاہی محل اور خاندان کی طرف اٹھنے والی آنکھ نکال اور انگلی کاٹ دی جاتی تھی۔ بڑے بڑے جغادری علما فضلا اپنے جبہ و دستار سے شہنشاہ کے قدموں کی دھول صاف کرتے تھے۔ اس عالم میں فرانس کا پڑھا ایک پی ایچ ڈی اسکالر میدان میں اترتا ہے۔ وہ چاہتا تو اپنے علم و قلم کو بیچ کر مخملاتی آسائش سے مزین زندگی بسر کرسکتا تھا مگر وہ تو برقِ تپاں تھا۔ اسے کوئی شاہ پیشوا نیام میں نہیں ڈال سکتا تھا۔ علی شریعتی نے اپنی گردن کو لائن پر رکھ دیا۔ سب سے پہلی صف میں کھڑے ہوکر پہلی گولی کھانے کے لیے آمادگی کا اظہار کرنا سب سے مشکل ہوتا ہے۔ پہلی گولی کھانے والے لوگ پیدا ہوتے رہیں تو باقی کا کام آسان ہوجاتا ہے۔

ایران کی سرزمین پر جہاں آمریت کی بلائیں لینے والے دانشور موجود رہے،

وہاں اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر للکارنے والے لوگوں کی کمی بھی ہرگز نہیں رہی۔ ایران میں علمائے مذہب کا ایک گروہ یقیناً ہر دور میں موجود رہا ہے جو مشکل سے مشکل وقت میں اسلام کی خدمت وعظمت کا پرچم بلند کیے رہا۔ شاہ کو بھی یقیناً ایسے علما کا سامنا تھا جن کو کچلنے کے لیے اس نے کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی۔ خود علی شریعتی نے جس وقت شعور سنبھالا، اس وقت ایران میں علمائے حق آمریت کے خلاف علمی وعملی جہاد میں مصروف تھے۔ خود علی شریعتی کے والدِ محترم تقی شریعتی اس ہراول دستے میں شامل تھے۔ اس کے علاوہ علما کے بڑے بڑے گروہ سرگرمِ عمل تھے۔ آیت اللہ روح اللہ خمینی باہائے انقلاب جدید ایران نے ہر قدم پر مزاحمت کی دیواریں کھڑی کر رکھی تھیں۔ انھوں نے ایران کے عوام کی مذہبی، فکری اور انقلابی قیادت کا فریضہ ملک کے اندر اور باہر سنبھال رکھا تھا۔ ان کی آواز پر پورا ایران لبیک کہنے کو تیار تھا۔

علی شریعتی نے بھی اس فضا میں آنکھ کھولی۔ وہ اس تحریک کا حصہ بن گیا۔ اس نے اپنے انداز میں اپنا قلم اور علم سنبھالا اور جدید علوم کی روشنی میں اسلام کی توجیہہ وتعبیر جدید تعلیم یافتہ لوگوں کے سامنے پیش کرنے لگا۔ جدید تعلیم یافتہ ایرانیوں نے علی شریعتی کی آواز پر لبیک کہا۔ اس کا پیغام گھر گھر کیسٹوں، پمفلٹوں اور سینہ بہ سینہ پہنچنے لگا۔ اس کا یہ رول سب سے اہم تھا، اس نے اس جدید نسل کو متاثر کیا، اسے میدانِ عمل میں اتارا جس نے جدید ایران کی منزل کو قریب کرنے کے لیے وہی کردار ادا کیا جو انقلاب فرانس کے لیے والٹیر نے ادا کیا تھا۔ یہ بات یاد رہے کہ والٹیر کو ہاف دی ریولیوشن کہا جاتا ہے۔ اس وقت کے ایران میں انقلاب کی بات کرنا رضا شاہ پہلوی کی ایرانی آمریت کو ہی ناراض کرنا نہ تھا بلکہ اس کے سرپرست امریکا بہادر کے مفادات کو بھی زک پہنچانا تھا۔ امریکی سرزمین کے بعد اس وقت امریکی ماہرین و مفادات کا سب سے بڑا مرکز تہران تھا۔ تہران کو بچانا گویا امریکا کو بچانا تھا۔ اس وقت کے باغیوں کی فکر شاہ و ساوک سے زیادہ پینٹاگون اور سی آئی اے سے تھی، جن کے لیے ایک آدمی یا چند آدمیوں کو مار دینا مکھی مچھر کے مار دینے سے زیادہ وقعت نہیں رکھتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ اس دور میں سیکڑوں ہزاروں ایرانی تشدد کا نشانہ بنے۔ علی شریعتی نے ان سب مصائب کو برداشت کیا۔ اس نے اپنے قول وعمل سے نوجوان تعلیم یافتہ نسل کو انقلاب کی راہ دکھانے کی

کوشش کی۔

علی شریعتی کسی بھی انقلاب کے لیے روشن فکر اور دانشور طبقے پر سب سے زیادہ ذمہ داری عائد کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے اوپر والا ظالم طبقہ تو ظلم کرے گا اور نیچے والا مظلوم طبقہ ظلم سہے گا۔ یہ درمیان والا طبقہ دانشور طبقہ ہی دراصل قوم کی شعورمند آنکھ اور اس کا قلم، علم پرچم ہوتا ہے۔ یہ طبقہ اگر بک اور جھک جائے تو قوم کی حالت کبھی نہیں بدلتی۔ چنانچہ اس طبقے کو بیدار کرکے میدانِ عمل میں اتارنا سب سے پہلا اور بڑا کام ہے۔ علی شریعتی نے اسی مشن کا بیڑا اٹھایا۔

علی شریعتی پر ابھی بہت کام کرنے کی ضرورت ہے۔ اس ادنیٰ سی کوشش کے ذریعے میں نے اس کے کلام کی کچھ جھلکیاں دکھانے کی سعی کی ہے۔ میری کوشش ہے کہ اس کی تمام تصانیف کا سلیس اردو ترجمہ کرکے یا ان کا خلاصہ بنا کر کلیاتِ شریعتی کے نام سے شائع کروایا جائے۔ پاکستان کے حالات ایران سے زیادہ مختلف نہیں۔ اوپر کا ایک خوردبینی طبقہ یکجا ہوکر پاکستان کو دونوں ہاتھوں سے لوٹ رہا ہے۔ اس نے اپنی ایک مستقل آمریت قائم کر رکھی ہے۔ ووٹ، الیکشن، حکومتوں کی تبدیلی اسی طبقے کے چند سو یا ہزار نفوس کے درمیان میوزیکل چیئرز کا کھیل ہے۔ نیچے کا اکثریتی طبقہ لٹ رہا ہے، پٹ رہا ہے، کٹ رہا ہے مگر اس کی صحیح قیادت کرنے والا کوئی نہیں۔ دانشور حکومتوں کے کاسہ لیس ہیں یا خوف زدہ اور سہمے ہوئے۔ ایسے عالم میں قوم کی فلاح اور حقیقی انقلاب کی راہ کھوئی جاچکی ہے۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ علی شریعتی کے کلام و پیام کی روشنی میں اس ملک کے متوسط دانشور طبقے کو بیدار کرکے مظلوم اکثریت کی بے لوث قیادت کے لیے سامنے لایا جائے۔ علی شریعتی کا یہی پیام تھا۔ اسی پیام کو عام کرنے کے لیے یہ تحریر سامنے لائی گئی ہے۔

یہ تحریر علی شریعتی کے حضور ادنیٰ اظہارِ عقیدت ہے۔ اس کی ساری خوب صورتیاں علی شریعتی کی ہیں اور ساری کوتاہیاں میری کوتاہ دستی کی پیداوار ہیں۔ اسے پسند کریں نہ کریں، ایک مرتبہ اس کو پڑھ ضرور لیں۔

ڈاکٹر ظہور احمد اعوان

علی شریعتی کون؟

''ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ میں پیرس کے ایک کیفے میں بیٹھا، لی موندے کا مطالعہ کر رہا تھا۔ بولیویا میں ہونے والے واقعات پر ایک تجزیاتی مضمون میرے زیرِ مطالعہ تھا۔ وہاں تازہ تازہ فوجی انقلاب آیا تھا۔ میرے ساتھ ہی ایک آدمی بیٹھا کھانا کھا رہا تھا۔ کھانا کھاتے اس کی نظریں میرے اخبار پر بھی پڑ رہی تھیں اور وہ پڑھنے کی کوشش میں مصروف تھا۔ مگر میں اس کی طرف متوجہ نہیں تھا۔ جب اس کی دلچسپی حد سے زیادہ بڑھتی نظر آئی تو میں نے پوچھا کہ آپ کس صفحے کو پڑھنا چاہتے ہیں۔ اس نے کہا میں صرف اقتصادیات کے صفحے سے دلچسپی رکھتا ہوں۔ مجھے بولیویا کے صفحے میں غرق دیکھ کر اس نے پوچھا تم بولیوین ہو؟ میں نے کہا، نہ میں بولیوین ہوں اور نہ سیاست دان بلکہ میں تو ایک ایرانی طالب علم ہوں۔ میں نے اس سے سوال کیا کہ تم کون ہو؟ اس نے کہا وہ اسرائیلی طالب علم ہے، اسے صرف ۶۰۰ فرانک وظیفہ ملتا ہے۔ میں نے پوچھا، تمھارا زرِمبادلہ کے نرخوں سے کیا تعلق ہے۔ اس نے

کہا، تم ایرانی طالب علم ہوکر بولیویا کی جدوجہدِ آزادی میں دلچسپی لے سکتے ہو تو میں ان فرانکس کے بارے میں کیوں نہ سوچوں جو میری جیب میں پڑے ہیں اور جن کی کمی بیشی پر میری زندگی کا دار و مدار ہے۔ وہ مجھے بیوقوف سمجھ رہا تھا اور میں دل میں اسے بیوقوف سمجھ رہا تھا۔'' (ادب کا نجات دہندہ) یہ اس ایرانی طالبِ علم کے خیالات تھے جو پیرس کی سوبورن یونی ورسٹی میں سماجیات کا فلسفہ پڑھ رہا تھا۔

قوموں کے آفاق پہ کبھی کبھی ایسے ستارے بھی طلوع ہوتے ہیں جو منور راہوں کی نشان دہی کرتے ہوئے خود تو موت کے گھاٹ اتر جاتے ہیں مگر قوموں کے مقدر کو سویروں سے ہم کنار کر جاتے ہیں۔ ایران کا نصیبا جب اَن گنت صدیوں کی تاریک آغوش میں جاگا تو فطرت نے اس کے چمن میں ایک پھول کھلا دیا۔ جس کی مہک نے شعر و نغمہ میں بسی اس خواب آگیں سرزمین کو آتشِ زیرِپا کردیا۔ ایران کا ایک شہزادوں جیسا حسین فرزند ایک غریب معلم کے گھر میں پیدا ہوتا ہے۔ یہی شخص تاریخ کے صفحات پر علی شریعتی کے طور پر ثبت ہے۔

علی شریعتی ۲۳ر نومبر ۱۹۳۳ء کو صوبہ خراساں کے ایک گاؤں مازینان میں پیدا ہوا۔ اس کے آبا و اجداد اپنے زمانے کے جید علما تھے اور شہری زندگی کی پراگندگی اور افراتفری سے دور کویر کے صحرا میں پرسکون زندگی گزارتے تھے۔ اس کے دادا آخوند حکیم جو فلسفہ، حکمت اور علومِ دین کے ماہر تھے، اگرچہ مازینان کے ایک چھوٹے گاؤں بیمن آباد میں رہائش پذیر تھے مگر ان کے علم و حکمت کی شہرت تہران، مشہد، اصفہان، بخارا اور نجف تک پھیلی ہوئی تھی۔ تہران میں تو خاص طور پر ان کو ''نابغہ'' خیال کیا جاتا تھا۔ ایران کے بادشاہ نصیر الدین شاہ قاچار نے انھیں تہران مدعو کیا اور مدرسۂ سپہ سالار میں فلسفہ پڑھانے پر مامور کیا مگر کچھ ہی عرصے بعد شہری زندگی نے ان کو بیزار کردیا اور وہ صحرائی زندگی کی آزاد اور معصوم فضاؤں کو لوٹ گئے۔ ان کو دولت و اقتدار کا ہرگز لالچ نہ تھا۔ علی شریعتی کو اپنے دادا میں اپنے وجود کا عکس نظر آتا تھا۔ وہ کہتا ہے کہ مجھے جو واقعات ان کے متعلق سنائے گئے ہیں، ان کو سن کر احساس ہوتا ہے کہ جیسے مجھ